© rasailojaraid.com



# برطانوی راج کے خلاف مسلمانان ہند کی سیاسی اور علمی جدوجہد (۱۷۵۷ء-۱۸۵۸ء)

ڈاکٹر اقبال حسین

## سیاسی جدوجہد

ہندوستان کی تاریخ میں جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جنگ کے دو نمایاں پہلو قابل توجہ ہیں۔ اول برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی "جنگ اور اتحاد" کی سیاست کے ذریعہ علاقائی توسیع، دوم ہندوستانی عوام کے مختلف طبقوں میں نئی حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطراب۔ عوام میں روز افزوں بے چینی کا مظاہرہ مقامی اور علاقائی بغاوتوں کی شکل میں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ہوتا رہا اور بالآخر اس کا اختتام ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی شکل میں نمودار ہوا جسے انگریزی مدبرانِ وقت نے بغاوت کا نام دے کر اس کی اصل اہمیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک اہم عنصر یعنی علمائے کرام نے، برطانوی حکومت کے قیام کے بعد سے ہی، اس کے خلاف نظریاتی جدوجہد کے ذریعہ، سبب اور ربط، کو خوب صورتی سے یکجا کر کے عوام کو اور بالخصوص مسلمانوں کو ایک عظیم تحریک کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس دور کے علما کی اکثریت اہلِ قلم اور اہلِ سیف کی تھی، ان کا یہ بھی بڑا کمال تھا کہ اُن کا علم، اسلام تک محدود نہیں تھا۔ اُن کی مختلف مذاہب جیسے یہودیت، نصرانیت اور ہندو مذہب پر بھی بہت اچھی نظر تھی۔ اس علمِ ادیان، کی وجہ سے وہ اسلام کی عظمت اور برتری کے ساتھ دیگر مذاہب اور ادیان کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانوی حکومت کی صد سالہ حکومت (۱۷۵۷ء-۱۸۵۷ء) کی لوٹ کھسوٹ، طور طریقوں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کی وجہ سے عوام کے ساتھ علما بھی الجھنوں کا شکار رہتے، اور اس حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔

پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستانی سیاست، معیشت کا ڈھانچہ بتدریج اپنی روایتی شناخت کھونے لگا تھا۔ اس کا اولین اثر بنگال پر ہوا کیونکہ برطانوی ہوس جہانبانی کا شکار سب سے پہلے یہی صوبہ ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کے ایک وفادار اور مستند مورخ سید غلام حسین طباطبائی کا بیان قابل توجہ ہے۔ وہ انگریزوں کو آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خراب طرز حکومت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اپنے انتباہ کو تقویت دینے کے لیے وہ شاہزادہ عالی گوہر (بعد ازاں شاہ عالم دوم) کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہزادہ بنگال اور بہار کے عوام میں ہر دل عزیز تھا۔ عوام اُسے عزت و احترام سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ مغل شہزادہ تھا جن کے اجداد نے ہندوستان میں بہت سے اچھے کام کیے تھے۔ لیکن اُنھی عوام نے اپنی نیک خواہشات، احترام اور ہمدردی کے جذبات ختم کر دیئے کیونکہ شاہزادہ عالی گوہر اپنی فوج کی زیادتیوں پر قابو نہیں رکھ سکے جس کی وجہ سے عوام اور رعیت مصائب کا شکار ہوئی۔ غلام حسین مزید رقمطراز ہیں کہ ابتدا میں عموماً عوام برطانوی حکمرانوں کے خلاف کسی قسم کا عناد نہیں رکھتے تھے لیکن جب وہ بھی کمپنی کے افسران اور اہل کاروں کو لوٹ اور تعدی سے روک نہ سکی تو اُن کا رویہ بدل گیا، کیونکہ کمپنی کے اعلا اور ادنیٰ ملازمین بددیانت تھے۔ غلام حسین اپنی تنقید جاری رکھتے ہوئے مزید رقمطراز ہیں کہ نئی حکومت کے زیر سایہ صنعت و حرفت تباہ ہوگئی جس کی وجہ سے اہل حرفہ بے روزگار ہوگئے، ان میں سے بیشتر یا تو کاسۂ گدائی لے کر شکم پروری کرنے لگے یا پھر اُنھوں نے قزاقی اور رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا، ایک کثیر تعداد میں لوگ تلاش معاش میں ترک وطن کر گئے۔[۱]

بنگال میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد حکومت کی تمام اہم اور ذمہ دار جگہوں پر تقرری میں امتیاز کی پالیسی، اور ملک کی دولت برطانیہ کو منتقل کرنے سے بے شمار لوگوں کو تباہ ہونا پڑا۔ غلام حسین غالباً پہلے ہندوستانی مورخ ہیں جنھوں نے ہندوستانی

---

[۱] سیر المتاخرین، نول کشور، ص ص ۳۷-۸۳۶



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دولت کے انگلینڈ منتقل کرنے پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "برطانوی تسلط سے پہلے معاملہ دگر تھا، پہلے یہ صاحبان (انگریز) سونا اور چاندی اس ملک میں لاتے تھے جو یہاں آنے کے بعد پہلے سے موجود ذخیرہ کو اور زیادتی کے ساتھ گردش میں لاکر ہر شخص کی خوشحالی میں اضافہ کرتا تھا۔[۱] بعد ازاں غلام حسین افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ نئی برطانوی حکومت کا عوام سے کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں ہے اور انھوں نے ان کو ان کی تجارتی سرگرمیوں سے محروم کر دیا ہے۔ صاحب علم وفن کی پذیرائی اور معیشت کا پرانا طریقہ کار، عطیہ جاگیرات وغیرہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ہندوستانیوں کو فوجی ملازمت نہیں دی جاتی ہے جو وہ زمانہ دراز سے حاصل کرتے رہے تھے۔ انگریزوں نے تجارت کو اپنی اجارہ داری میں لے لیا ہے۔ مزید براں اُن کی اپنے ہم وطنوں کی نامناسب جانب داری کے طرز عمل نے ہندوستانیوں کے لیے سخت حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد غلام حسین طبا طبائی ایک اہم اور معنی خیز جملہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام، مغل بادشاہ ہی کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں[۲] ظاہر ہے کہ بنگال میں مغل حکومت کے سیاسی زوال اور برطانوی حکومت کے اقتدار کے باوجود، عوام کا مغل بادشاہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مغل بادشاہ کی ہردل عزیزی کس حد تک قائم تھی۔ کمپنی کی حکومت بھی اس نکتہ سے آگاہ تھی جس کا ثبوت ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم بادشاہ اور برطانوی کمپنی کے معاہدہ سے ملتا ہے جس کے تحت شاہ عالم نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑلیسہ کی دیوانی کے حقوق بطور عطیہ دئے تھے اور انگریزوں نے شاہ عالم کی فرماں روائی تسلیم کرتے ہوئے، ان کو مبلغ ۲۶ لاکھ روپئے سالانہ بطور خراج دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی[۳] عملاً، بلاشبہ صورت حال دوسری تھی، کیونکہ انگریز یہ رقم پنشن کی طرح ادا کر رہے تھے۔ جسے اُنھوں نے شاہ عالم کے الہ آباد چھوڑنے کے بعد عملاً بند ہی کر دیا۔ تاہم، عوام میں مغلوں کی ہردل عزیزی اور مغل بادشاہ سے اُن کے لگاؤ کے پیش نظر مصلحت یہی

---

[۱-۲] سیر المتاخرین، ص ص ۸۱۰ - ۸۷۰، ۸۳۶

[۳] معاہدہ کی شرائط کے لیے ملاحظہ ہو، AITCHISON کی کتاب Treaties Engagements and Sanads. Vol II P-244



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سمجھی کہ نام کے لیے مغل بادشاہت کو برقرار رکھا جائے۔ یہ اور بات تھی کہ انگریزی حکمرانوں نے مغل بادشاہ کی تاریخی اہمیت اور سیاسی قوت کو کمزور کرنے کے لیے' اودھ میں نوابی کو شاہی میں تبدیل کر دیا، آہستہ آہستہ وہ مغل بادشاہ کو زیادہ سے زیادہ شکنجے میں کستے گئے اور بالآخر اُسے بالکل بے دست و پا کر دیا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد میں صورتِ حال یہ تھی کہ بادشاہ نام کا بادشاہ تھا۔ لال قلعہ کے باہر برطانوی کمپنی کی حکمرانی تھی۔ تاہم وہ ہندوستانی عوام کے دلوں کا بادشاہ تھا، وہ اُسی کو اصل حکمران اور کمپنی کی حکومت کو اُس کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ اس کا مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں مجاہدینِ آزادی کے بجنور، بریلی، دہلی، بدایوں، باندہ، جھانسی، کان پور اور الٰہ آباد میں جاری کردہ اعلانیوں سے ہوتا ہے[1]۔

یہ بات بہت اہم اور دلچسپ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب سرسید نے 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھی تو برطانوی حکومت کے خلاف عوام کی شکایات کا ذکر جو اُنھوں نے صراحت سے کیا ہے وہ کم و بیش وہی ہیں[2] جن کی طرف تقریباً اسّی سال قبل غلام حسین طباطبائی نے انگریزوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی، ظاہر ہے پلاسی کی جنگ کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں نے ہندوستانی عوام کی شکایات کا کوئی ازالہ نہیں کیا، ردعمل کے طور پر مقامی بغاوتیں شروع ہونے لگیں۔ جیسا کہ اہلِ علم واقف ہیں کہ بنگال میں ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی برطرفی اور قتل کے بعد انگریزوں نے ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی تھی۔ اس حکومت کی سربراہی برائے نام میر جعفر کی تھی لیکن پس پردہ انگریزوں کی حکمرانی تھی۔ تبدیلیٔ حکومت کا اثر طبقۂ امراء پر پڑا، چونکہ بنگال میں حکمرانی مسلمان نواب کی تھی اور یوں بھی یہ صوبہ تقریباً پانچ صدی سے مختلف مسلم حکمرانوں کے زیر اثر رہا تھا، اس لیے اس کا بدترین شکار مسلمان ہی ہوئے، مسلمان اپنے تاریخی ماضی اور سیاسی اقتدار کی وجہ سے حکومتِ بنگال میں صدیوں سے

---

[1] سرسید احمد خاں، سرکشی ضلع بجنور، ایڈیٹر شرافت حسین مرزا، ص ص، ۱۷۶، ۱۳۶، وشنو بھٹ، ماجھا پرواس، ایڈیٹر امرت لال ناگر، ص ص ۸۳-۸۲۔ کرنل سلی مین (SLEEMAN) ڈھول پور اور بندیل کھنڈ کے راجاؤں پر اس لیے برہم ہوا کہ ان ریاستوں نے اپنی مُہروں میں یہ کندہ کرایا تھا کہ وہ مسلمان بادشاہ کی قائم کردہ اور غلام ہیں، جب کہ اُن کو انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ ملاحظہ ہو Sleeman, Rambles and Recollections P-389

[2] الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ص ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۷، ۹۰۱-۹۰۵، ۹۰۷-۹۱۰، ۹۱۷، ۹۱۳-۹۱۲۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



نظم ونسق کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے رہے تھے لیکن نئی برطانوی حکومت کے عہد میں، سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اعلیٰ عہدوں پر اُن کی تقرری کم سے کم ہوتی گئی۔ میر جعفر نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسّی ہزار سپاہیوں کو، انگریزوں کے اشارہ پر برطرف کر دیا[1]۔ علاوہ ازیں بہت سے مسلمان خاندانوں کو بطور عطیہ دی جانے والی معاشی مدد، ائمہ جاگیرات اور التمغا جاگیرات کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ بہت سے قدیمی مسلمان خاندان، جن کے پاس گذشتہ سلاطین کی عطا کردہ جاگیرات تھیں، نئی حکومت کی زرعی پالیسی کا شکار ہوکر اپنی املاک اور جاگیریں کھو بیٹھے[2]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ حساس اور متاثر افراد نئی حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھانے لگے۔ پلاسی کی جنگ کے بیس سال کے اندر ہی، برطانوی کمپنی کی حکومت کے خلاف سب سے پہلی بغاوت رانو خاں نے چکما اور کوکی قبائل کو منظم کرکے شروع کی۔ برطانوی حکومت جب بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام رہی تو اُس نے عیاری سے کام لے کر پہلے دونوں قبائل کے اتحاد کو توڑ دیا۔ کوکیوں کے رہنما جوان بخش کو ورغلایا گیا کہ چکما قبیلہ کے لوگ کوکیوں کی قیمت پر اپنے مفادات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ نسلی تعصب کو بھڑکا کر اور جوان بخش کو رشوت دے کر، برطانوی سامراج کے شاطروں نے اتحاد کو توڑ ڈالا۔ رانو خاں، ان ریشہ دوانیوں کا مقابلہ نہ کرسکا اور کہیں روپوش ہوگیا جس کی وجہ سے بغاوت ناکام ہوگئی[3]۔

رانو خاں اور جوان بخش کی بغاوتیں محدود مسائل کی بنا پر تھیں اور بنگال کے دور افتادہ علاقوں تک محدود تھیں، لیکن یہ امر قابل توجہ ہے کہ بغاوت بنگال ہی میں ہوئی جہاں پہلی بار انگریزوں نے قدم جماکر، دوسرے علاقوں پر دست اندازی شروع کی تھی۔ بنگال

---

[1] Econmic History of Bengal PP 95-96 N.K. Sinha,

[2] فرانسس بُکانین An Account of the Districts of Bihar and Patna in 1811-12 pp 561-62
سیر المتاخرین ۸۴۰-۴۱۰۱

[3] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، Challenge, A Saga of India's struggle for Freedom. ed, Nitish R. Ray and others, New Delhi 1984, PP 122-29



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ اول یہ بہت زرخیز صوبہ تھا۔ صنعتی طور پر بہت منظم اور عوام خوشحال تھے۔ دوم پورے صوبہ پر مسلمانوں نے کئی صدیوں تک حکومت کی تھی۔ صوبہ کی اکثر آبادی مسلمان تھی چنانچہ تجارت اور اعلیٰ و ادنیٰ شہری و فوجی ملازمتوں میں بھی اُن کی اکثریت تھی۔ وہ بہ حیثیت مجموعی ۱۷۵۷ء تک معاشی طور پر خوش حال تھے۔ تبدیلیٔ حکومت نے اس پورے نظام ہی کو درہم برہم کردیا تھا جس کے نتیجہ میں بغاوتیں اور شورشیں برپا ہونے لگیں۔ رالوخاں اور جواں بخش کی بغاوتوں کا سبب بھی تبدیلیٔ حکومت اور نظام تھا۔

رالوخاں کی بغاوت کے بعد ۱۷۸۳ء میں، بنگال میں ایک بار پھر عوام انگریزی راج کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بغاوت کی پشت پناہی کچھ زمین دار بھی کر رہے تھے کیونکہ اُن کی شکایت یہ تھی کہ نئی حکومت کے قیام کے بعد لگان میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا، جو اُن کے وسائل سے باہر تھا۔ اُن کو زبردستی بڑھی ہوئی شرح پر لگان کی ادائیگی کے لیے معاہدوں پر دستخط کرائے جارہے تھے، وقت پر لگان نہ جمع کرنے کی صورت میں انھیں اُن ہی کی کچہریوں میں قید کرکے ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اُن کو کئی اور نئے ناجائز ٹیکسوں کی ادائیگی پر بھی مجبور کیا جاتا تھا۔[۱]

رعیت پر بھی ناواجب اور اُن کی قوتِ ادائیگی سے زیادہ ٹیکس لگادئے گئے تھے۔[۲]

بڑی حد تک بنگال کی ابتدائی بغاوتوں کو عوامی بغاوت کہا جاسکتا ہے۔ ہم وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان بغاوتوں میں علماء کا کیا کردار رہا ہے، قرائن سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی مخالفت نہیں کی ہوگی۔

جہاں ایک طرف بنگال میں انگریزی سامراجیت کے خلاف لوگوں میں ایک طرح کی بیداری پیدا ہورہی تھی وہیں دوسری طرف میسور میں شیر میسور، ٹیپو کی قیادت میں مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم تھی۔ انگریزوں کے خلاف جذبات موجود تھے۔ ٹیپو سلطان انگریزوں کی شاطرانہ اور مکارانہ چالوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے

---

[۱] Narhari Kaviraj, A Peasant uprising in Bengal 1783 p 47-

[۲] ایضاً ص ۵۰-۵۱۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کرنے کے لیے اور مسلمانوں کو منظم اور متحد کرنے کے لیے، جہاد کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ٹیپو سلطان نے، ماضی کے مسلمان فرمانرواؤں سے ہٹ کر یہ رائے قائم کی تھی، مسلمانوں پر زوال کا سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے اُن احکاماتِ الٰہی کو بھلا دیا جو اُن تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہونچائے تھے۔ ٹیپو سلطان نے مسلمانوں کی یاد دہانی اور اس پر عمل پیرا ہونے کی نیت سے، ۳۰ رمئی ۱۷۸۶ء کو، اپنی دستخطِ خاص اُدھر سے دینی احکامات جاری کیے، تاکہ مسلمان ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ سلطان نے مسلمانوں کو جہاد میں شامل ہونے کے لیے قرآنی آیات کو بطور سند پیش کیا اور ایک اعلانیہ کے ذریعہ شرعِ محمدی جاری کرنے کی کوشش کی[۱]۔ ہندوستان میں اس کے بعد جو بھی تحریک مسلمانوں نے چلائی، اس میں ہر جگہ 'جہاد' کو بطور موثر حربہ اختیار کیا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں، ویلور میں مسلمان فوجی سپاہیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد ہی کا نعرہ بلند کیا تھا[۲]۔ گو یہ بغاوت بھی کچل دی گئی لیکن انگریزی حکومت کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی آگ مسلمانوں کے دلوں میں آہستہ آہستہ پھیلتی رہی۔

۱۸۱۰ء میں عبدالرحمٰن نے گجرات کے مشہور شہر سورت میں انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے مانڈوی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ بغاوت بھی دبا دی گئی۔ سورت کی بغاوت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عبدالرحمٰن نے بغاوت کو استحکام دینے اور مسلمانوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے امام مہدی کا دعویٰ کیا تھا، اس طرح اسے مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا[۳]۔ عبدالرحمٰن کی بغاوت کو مسلمانوں کے علاوہ مراٹھوں کی بھی ہمدردی حاصل تھی کیونکہ ۱۸۰۲ء مراٹھا پیشوا باجی راؤ دوم کے 'ذیلی اتحاد' (Subsidiary Alli-ance) قبول کر لینے کے بعد، عام طور سے انگریزوں کے خلاف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

---

۱۔ محمود خاں بنگلوری، صحیفۂ ٹیپو سلطان، دہلی ۱۹۷۱ء، ص ص۔ ۵۱۹، ۱۹۔ ۶۰۹

۲۔ Evan Balls, Memoires of General Briggs Cited in Joshi's Rebellion 1857, p-74

۳۔ S.B. Chaudhri, Civil Disturbances during British Rule in India 1765-1857, p-177



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



برطانوی حکومت کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف اگرچہ یہ بغاوتیں مقامی نوعیت کی تھیں تاہم ان بغاوتوں کے بانی اور رہنما مسلمان ہی تھے جو اپنے طور پر، ابھرتی ہوئی غیر ملکی طاقت کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صدیوں تک مسلمانوں کی سیاسی برتری کی وجہ سے عوام کی نگاہ میں بھی مسلمان ہی رہبری کے اہل تھے۔ آہستہ آہستہ مقامی بغاوتوں نے نیا رخ اختیار کیا۔ اس میں ۱۷۹۳ء کے 'استمراری بندوبست کے نفاذ کا، جس کا آغاز بنگال سے ہوا، بڑا اہم کردار رہا ہے۔ بنگال کی آبادی میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے (مرشد قلی خاں) لے کر میر جعفر کے دورِ اقتدار تک، بنگال میں زمین داری کے نظام میں زبردست تغیر آنے کی وجہ سے، قدیم زمین دار، جن کی اکثریت مسلمانوں کی تھی، برباد ہو گئے۔ استمراری بندوبست بھی زرعی نظام میں ایک تجربہ ہی تھا، اس کے تحت زمین کی ملکیت دائمی طور پر اُن افراد کے حق میں تسلیم کر لی گئی، جن کا بندوبست کے وقت قبضہ تھا۔ یہ اقدام بغیر کسی تفتیش کے اُٹھایا گیا اور نہ ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ زمین کا قانونی طور پر کون وارث ہے[۱]۔ استمراری بندوبست کا بہت بُرا اثر بنگال، بہار اور اڑلیسہ کے طبقہ امراء اور اُن کے اخلاف پر پڑا۔ یہ طبقہ پہلے ہی نظامت کے خاتمہ کی وجہ سے مشکلات سے دوچار تھا[۲]۔ رعیت تو ۱۷۶۵ء ہی سے تباہ حالی کا شکار تھی، کیونکہ اجارہ داری کے نظام کی وجہ سے اُن پر لگان کا بوجھ کئی گنا بڑھ گیا تھا[۳]۔ مزید برآں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں نے ۱۷۶۵ء میں مقرر کردہ بنگال کے نواب کے الاؤنس کی رقم ترپن لاکھ چھیاسی ہزار روپیوں سے گھٹا کر ۱۷۷۳ء میں صرف سولہ لاکھ روپیے کر دی جس کی وجہ سے کثیر تعداد میں وہ لوگ متاثر ہوئے جو نواب کے ذاتی ملازم تھے۔ بیکاری کا شکار یہ لوگ، جن میں سپاہی، زمین دار،

---

[۱] Badan Powel, A Short Account of the Land Revenue and its Administration in India, Londan 1894 Vol. I p-407

[۲] A.R. Mallick, British Policy and the Muslims in Bengal, Dacca 1977, p-38. Buchanan's, Account of the Districts of Bihar & Patna, pp 561-62

[۳] Economic Annals of Bengal pp. 97-98



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کی ملازمت میں ہتھیار بند اور لاٹھی بردار اور بہت سی جگہوں پر زمین دار، ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ڈاکو اور راہزن بن گئے۔ گو کہ ڈکیتوں اور رہزنی کی روک تھام کمپنی کی حکومت نے کر دی لیکن عوام کی بے چینی نے منظم بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔

رعیت پر ایک نئی افتاد نیل کے یورپین تاجروں کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ظالمانہ سلوک کی شکل میں پڑی۔ نیل کے یورپین تاجروں کی بھرپور اعانت، سیاسی اور مالی مفاد کے پیش نظر، حکومت وقت کر رہی تھی۔ بنگال کی رعیت ان ظالموں کے جور و ستم کا شکار ہو رہی تھی۔ ان حالات میں حاجی شریعت اللہ[1] نے ان ظالموں کے خلاف رعیت کو منظم کیا۔ حاجی شریعت اللہ صاحب کے سامنے دو بڑے اور اہم مسئلے تھے۔ اول یہ کہ بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت اسلام سے والہانہ عقیدت اور احترام کے باوجود مشرکانہ اور بدعتی رسم و رواج کا شکار تھی۔ قدیم زمین داروں کی تباہی کے بعد نئے زمین دار بیشتر غیر مسلم تھے۔ ان کے اثرات کے تحت اور برطانوی حکومت کے جابرانہ رویہ کی وجہ سے، عام طور سے مسلمان رعیت پست ہمتی، غربت اور خوف و ہراس میں مبتلا تھی۔ مسلمانوں کو اس قعر مذلت سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ اُن کو دین کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا جائے[2]۔ حاجی صاحب نے مسلمانوں کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں فرائض پر قائم رہنے کی تلقین کی۔ حاجی صاحب کی کوششیں بارآور ہوئیں اور مختصر عرصہ میں سیکڑوں کی تعداد میں رعیت اُن کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔ ہر چند کہ حاجی شریعت اللہ صاحب کی تحریک پر مذہب غالب تھا لیکن اس کا سیاسی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے پیرو کار رعیت نے سرکار اور خصوصاً زمین داروں کے ناجائز اور غیر قانونی ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر دی[3]۔ حاجی صاحب کی تحریک کا جب مثبت نتیجہ نکلنا شروع ہوا تو نیل کے

---

[1] آپ بندر کھولا، ضلع فرید پور کے باشندہ تھے۔ کم عمری میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، مکہ میں بیس سال تک قیام رہا۔ وہاں آپ شیخ طاہر مکی کے مرید ہوئے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد فرید پور سے اپنی اصلاحی تحریک کا خاموشی سے آغاز کیا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ اے۔ آر ملک ص ص ۸۳-۸۷۔

[2] اے، آر، ملک، ص ص ۸۳-۷۹۔

[3] اے، آر، ملک نے ان ٹیکسوں کی تفصیلات دی ہیں، ان میں داڑھی رکھنے پر ٹیکس، شادی، ولادت درگا پوجا، دسہرہ وغیرہ کے ٹیکس بھی وصول کیے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو، صفحات ۸۴-۸۰



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تاجران اور زمین دار بوکھلا گئے۔ اُن کی تحریک کو فرقہ وارانہ، اور سرکار مخالف قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ حاجی صاحب کو جعلی مقدمہ میں ملوث کرکے سزا دلانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ حاجی صاحب کے انتقال کے بعد تحریک کی قیادت، جواب فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہو چکی تھی، اُن کے فرزند دودو میاں نے سنبھالی۔ دودو میاں نے تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اُن کا اعلان تھا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور جو اس پر ہل چلاتا ہے وہی اس کی پیداوار کا حق دار ہے۔ دُودو میاں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے اور نہ ہی اُس پر کوئی ٹیکس عائد کیا جا سکتا ہے[1] دودو میاں کے انقلابی اعلانات کی وجہ سے ایوان حکومت اور زمین داروں کے اندر ہیجان اور اضطراب پیدا ہو گیا۔

فرائضی تحریک کو حکومت اور ہندو زمین داروں نے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا حالانکہ یہ تحریک فرقہ وارانہ نہیں تھی[2] تحریک کا آغاز برطانوی حکومت اور زمین داروں کے استحصال کی پالیسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ فرائضی تحریک میں شامل مجاہدین کا نشانہ ظالم اور جابر زمین دار تھے ان میں کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی[3] فرائضی تحریک کا اصل ہدف انگریز تھے۔ دُودُو میاں کے پرچم تلے تقریباً ۸۰ (اسی) ہزار مسلمان جمع ہو چکے تھے ان میں اکثریت رعیت اور دستکاروں کی تھی، کیوں کہ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد یہی لوگ سب سے زیادہ تباہ ہوئے تھے۔ Dampier (ڈیمپیر) سپرنٹنڈنٹ پولس بنگال لکھتا ہے کہ فرائضیوں کا اصل مقصد برطانوی حکومت کی تباہی اور مسلم حکومت کا قیام تھا[4] یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ تحریک کے ایک اور قائد ٹیٹو میر کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ قبائلی کول کی بغاوت (۱۸۳۱ء) کے اہم رکن تھے[5]

---

[1] اے، آر، ملک، ص ص۔ ۹۰-۸۰

[2] W.W. Hunter, The Indian Musalmans 1969, p-101

[3] ہنٹر، ص۔ ۱۰۱

[4] Selections from the Records of Bengal p-141

[5] N.R. Ray (ed) Challenge, A Saga of India's Struggle for Freedom N. DELHI 1984 pp. 122-29



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ نہ تو حاجی شریعت اللہ نے اور نہ ہی ان کے پیروکاروں نے۔ برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کو جہاد قرار دیا، تاہم اس پوری تحریک میں بلاواسطہ یہ تصور غالب تھا اور فرائضی اس جنگ میں کام آنے کو درجہ شہادت سمجھتے تھے۔

فرائضی تحریک کا دائرۂ کار اور اثرات بنگال تک محدود رہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں، ایک بے حد موثر اور کامیاب تحریک سید احمد شہید کی قیادت میں شروع ہوئی، جس کو بدنام کرنے اور خود مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی غرض سے اسے "وہابی تحریک" کا نام دیا گیا۔[۱]

سید احمد بریلوی اپنی ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں مکمل کرنے کے بعد، شاہ ولی اللہ کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم حاصل کرنے دہلی پہونچے۔ اُن کے قیام دہلی میں ہی ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر اقتدار حاصل کر لیا تھا جس کے نتیجہ میں شاہ عبدالعزیز اور مولوی عبدالحیٔ کے مشہور فتاویٰ جاری ہوئے تھے جس کی رو سے ہندوستان دارالاسلام باقی نہیں رہا تھا۔ ان فتووں نے برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کے لیے شرعی طور سے راہیں ہموار کر دی تھیں۔[۲] سید صاحب کا بنیادی مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج تھا[۳] اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے مسلم معاشرہ کی اصلاح، ایک تنظیم کے قیام، قرآن اور حدیث کی تعلیمات کو مزید رواج دینا اور جہاد کے لیے ضروری اور بنیادی فوجی تربیت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔

سید احمد بریلوی مزاجاً خاموش طبع تھے۔ آپ ایک مدبر اور دور اندیش رہنما تھے۔ جہاد کے لیے جہاں افراد کی ضرورت تھی وہیں مستقل وسائل اور ایک محفوظ مقام کی بھی ضرورت تھی جسے مستقر بنا کر تحریک کا آغاز کیا جا سکے۔ ہندوستان کی سیاسی

---

۱ ایک جدید تاریخ نگار Avrill Ann Powell, لکھتا ہے کہ ۱۸۰۳ء کے بعد کی تحریروں میں شاہ عبدالعزیز کا رویہ رواداری کا تھا۔ ملاحظہ ہو Muslim and Missionories in Pre-Mutiny India Surrey 1993 p-72.

۲ سید ابوالحسن ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ص ۹۰۔ ۳۸۹، غلام رسول مہر، جماعت مجاہدین، ص ص ۱۴-۱۳۔

۳ سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ص ۹۰۔ ۳۸۹، قیام الدین احمد، ص ص ۶۶۔ ۳۶۵۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تبدیلیوں، اس کے اثرات اور مسلمانوں کے بچے کھچے طبقہ امرا سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے[۱] ایک تجربہ کار فوجی[۲] کی طرح وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ کس طرح ماضی میں مسلمانوں اور ہندو والیان سلطنت کی انگریزوں کے خلاف حربی جد وجہد ناکام رہی تھی اور اس کی بہترین مثال شیر میسور ٹیپو سلطان کی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کا مکمل تسلط قائم ہو چکا تھا اور ایسی صورت حال میں، ہندوستان کی سرزمین کسی بھی حربی تحریک کے لیے مناسب نہیں تھی۔ انگریز بآسانی تحریک کو ختم کر دیتے۔ تمام نشیب وفراز پر غور کرنے کے بعد سید احمد بریلوی نے تحریک کا مستقر، شمالی ہند کے سرحدی علاقہ میں قائم کیا۔ اس کے دو اہم پہلو تھے۔ فوجی نقطۂ نظر سے سرحد کا پورا علاقہ جنگ جو پٹھان مسلمانوں کے زیر اثر تھا۔ یہاں ایک اچھی فوج منظم کی جا سکتی تھی۔ دوم، بغیر کسی مداخلت کے، اس علاقہ کے عوام کو آسانی کے ساتھ تحریک میں شامل کیا جا سکتا تھا کیونکہ سکھوں کے پنجاب اور سرحد سے ملحق علاقہ جات میں مظالم کی داستان سے سرحدی عوام غم وغصہ میں تھے۔ انھیں قائد کی ضرورت تھی۔

حالات کے پیش نظر سید احمد بریلوی نے تحریک کا آغاز شمالی مغربی سرحد سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن تحریک کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے، پٹھانوں کی اصلاح بھی ضروری تھی۔ اُن کے اندر قبائلی عصبیت، خون خرابہ، اور مذہب سے بیگانگی کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سید احمد شہید نے، پٹھانوں کی تربیت کے لیے قاضیوں کی تقرری کی۔ جا بجا معلمین اور پیش امام مقرر کیے گئے۔ خون خرابہ کے بجائے قاضیوں کی عدالت سے رجوع کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی، قرآن اور حدیث کی روشنی میں حرام اور حلال میں امتیاز کرنے کی تلقین کی گئی۔ غیر شرعی امور سے گریز کرنے پر زور دیا گیا، صرف اُن ٹیکسوں کے نفاذ پر زور دیا گیا جو قرآن سے ثابت تھے، معمولی تاجروں، رعیت اور دستکاروں پر ٹیکس عائد کرنا، غیر اسلامی طریقہ بتایا گیا۔ اصلاح معاشرہ کے بعد، پٹھانوں

---

[۱] قیام الدین احمد، دی وہابی موومنٹ۔ ص ۶۶ - ۳۶۵

[۲] انھوں نے امیر خاں، نواب ٹونک کے فوجی رسالہ میں تقریباً آٹھ سال تک کام کیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کی بڑی تعداد، سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ ہوگئی۔ سید احمد کی قیادت میں سکھ حکومت کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی۔ مجاہدین نے بے سروسامانی کے باوجود ہمت اور استقلال سے، سکھوں کی فوج پر کئی یورشیں کیں، پشاور پر قبضہ کرلیا، لیکن جلد ہی سکھ افواج کے دباؤ کی وجہ سے انھیں شہر چھوڑنا پڑا۔ اس حربی جدوجہد کو شدید دھکا اس وقت لگا جب مئی ۱۸۳۱ء میں، سید احمد بریلوی دغا بازی اور غداری کا شکار ہوکر شہید کردیئے گئے۔[۱] سید صاحب کی شہادت، تحریک کے لیے بڑا صدمہ تھا، سید احمد شہید کے جانثاروں نے بہرحال تحریک کو جاری رکھا۔[۲]

سکھوں کی حکومت رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد، انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوکر دم توڑ گئی۔ پنجاب پر انگریزوں کی براہ راست حکمرانی قائم ہونے کے بعد، سید احمد شہید کی تحریک کا رخ فطری طور پر انگریزوں کی طرف ہوگیا۔ مجاہدین نے سرحدی علاقوں میں، مقامی باشندوں کی مدد سے تحریک کو جاری رکھا، اور چالیس برس تک، برطانوی حکمرانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج بنے رہے۔[۳]

سید احمد شہید کی تحریک سے چند برس پہلے، بریلی کے ممتاز اور مقتدر مفتی محمد عیوض نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں کو منظم کیا تھا۔ مفتی صاحب، بریلی اور اطراف کے علاقوں میں بہت عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے، غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ روہیلوں اور انگریزوں کی حکومتوں میں بدستور اپنے منصب پر فائز رہے۔ حافظ رحمت خاں نے اپنے دورِ حکومت میں مفتی صاحب کو بریلی میں اس عہدہ پر فائز کیا تھا۔ حافظ رحمت خاں والی اودھ، انگریزی گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کی سازشوں کا شکار ہوکر ۱۷۷۴ء میں شہید ہوگئے تھے۔[۴] ۱۸۰۱ء میں

---

۱۔ اے۔ آر۔ ملک ص ۱۲۵، قیام الدین احمد، ص ۴۳۔

۲۔ اے۔ آر۔ ملک، ص ص ۱۳۲۔ ۱۲۵۔

۳۔ تارا چند، فریڈم موومنٹ اِن انڈیا، جلد دوم، ص ص، ۳۰۔ ۲۷، قیام الدین احمد، ص ص ۲۰۹۔ ۱۷۸

۴۔ سید الطاف بریلوی، حیات حافظ رحمت خاں، کراچی ۱۹۶۳ء ص ص۔ ۸۵۔ ۲۲۷، مستجاب خاں گلستانِ رحمت، علی گڑھ مخطوطہ، ص ۲۱۶ الف۔

۴۰۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



روہیل کھنڈ پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا تھا مگر مفتی صاحب بدستور اپنے عہدہ پر قائم رہے ۱۸۱۶ء میں وہ خاصے معمر تھے۔ روہیل کھنڈ کے مسلمان انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے کیونکہ اُنھوں نے اُن کے محبوب حکمراں حافظ رحمت کے خلاف سازش کی تھی۔ وہ ۱۷۷۴ء کی جنگ حافظ رحمت خاں کی شہادت اور بڑی تعداد میں روہیلوں کی ملک بدری کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف اندر ہی اندر آگ دہک رہی تھی ستم برآں انگریزوں نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنے قوانین نافذ کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ۱۸۱۲ء میں لگان میں اضافہ کر کے روہیل کھنڈ کی رعیت کی مشکلات میں شدید اضافہ کر دیا گیا تھا[۱]۔ دو سال بعد ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے روہیل کھنڈ کے عوام پر چوکیداری ٹیکس لگا دیا۔ روہیل کھنڈ کے مختلف علاقوں میں عوام نے اس ٹیکس کے نفاذ پر احتجاجات کئے۔ بریلی کے عوام نے بھی حکومت سے اس ٹیکس کو واپس لینے کا مطالبہ کیا، بریلی کے حکام نے جبری وصولی کے احکامات جاری کیے جس کی وجہ سے عوام اور حکومت کے اہل کاروں کے مابین ٹکراؤ ناگزیر ہوگیا۔ مفتی صاحب نے اس جبری وصولی کے خلاف عوام کو یکجا کیا اور احتجاج نے جہاد کی شکل اختیار کر لی۔ دراصل مفتی صاحب نے عوام کے استفسار پر یہ رائے دی تھی کہ چوکیداری ٹیکس کا نفاذ ایک طرح سے مسلمانوں پر جزیہ عائد کرنا ہے۔ اس فتویٰ کے بعد عوام نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا[۲]، اور حکومت سے چوکیداری ٹیکس واپس لینے کی درخواست کی۔ عوام کی درخواست کے جواب میں ضلع مجسٹریٹ نے درشت اور غیر مہذبانہ رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے حالات اور خراب ہوگئے۔ ٹیکس کی جبری وصولی کے لیے ایک ظالم اور بدنام زمانہ غیر مسلم اہلکار کو مقرر کیا گیا۔ مفتی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت کی، نتیجہ میں نہتے اور پرامن مظاہرین پر گولیاں چلا دی گئیں۔

---

۱؎ Atkinson. Statistical and Discriptive Account of N W P Vol. V p.676. صدیق حسن، تاریخ قنوج، علی گڑھ مخطوطہ، جلد اول ص ۴۷-۴۶

۲؎ Marquis of Hastings. The Private Journal... Allahabad 1907 pp 249-50

تاریخ قنوج، ص ص ۴۷-۴۶



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سات افراد جاں بحق اور بہت سے زخمی ہو گئے[1] اس پس منظر میں مفتی صاحب نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا۔ مفتی صاحب کے فتویٰ جاری کرنے کے بعد بریلی اور اطراف وجوانب کے مسلمانوں نے لبیک کہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ ہزار روہیلہ پٹھان، تلوار اور آتشیں ہتھیاروں سے لیس ہو کر مفتی صاحب کے گرد جمع ہو گئے۔ ۱۸ اپریل ۱۸۱۶ء کو یہ تعداد بڑھ کر بارہ ہزار ہو گئی[2]۔ پیلی بھیت، شاہجہاں پور، مراد آباد، رام پور کے پٹھان بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر بریلی کی طرف کوچ کرنے کو تیار تھے۔ مقامی حکام نے صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فریب کی راہ اختیار کی تاکہ باہر سے مدد آ سکے۔ ۱۸ اپریل کو فوجی امداد ملتے ہی اچانک مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ دو سو افراد اس حملہ میں جاں بحق ہو گئے اور بہت سے مجروح۔ اس جدوجہد کو بھی فوجی طاقت استعمال کر کے کچل دیا گیا۔ مارکوئیس ہیسٹنگز لکھتا ہے کہ اگر دو دنوں تک یہ بغاوت اور جاری رہتی تو پورا روہیل کھنڈ انگریزوں کے خلاف ہتھیار بند ہو کر صف آرا ہو گیا ہوتا[3]۔ ممکن ہے کہ مفتی عیوض صاحب کے فتویٰ جہاد سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو۔ اگر روہیل کھنڈ کی تاریخ اور وہاں کے عوام کے جذبات کو سامنے رکھا جائے تو اس سے اختلاف مشکل ہے۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے احمد اللہ شاہ[4] کی شخصیت بھی بڑی اہم نظر آتی ہے۔ آپ شاہ محراب علی گوالیار کے مرید تھے اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اُن کے پیر نے ہی ان کو جہاد کی تلقین کی تھی[5]۔ یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ سید احمد بریلوی اسی راستہ سے گذرے تھے۔ گوالیار میں قیام کے دوران آپ نے وہاں کے مقتدر مرہٹھا، ہندو راؤ سے بھی مہم کے لیے مدد مانگی تھی[6]۔ ممکن ہے کہ اسی دوران محراب علی شاہ اور

---

[1] The Prive Journal pp 249-50.

[2] The Private Journal pp 249-50، تاریخ قنوج، ص ص ۴۷، ۶۴۔

[3] The Private Journal p.p. 250-52

[4] حیات اور کارناموں کے لیے، ملاحظہ ہو، ابرار حسن فاروقی، ماثرِ دلاوری، انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل۔جون ۱۹۸۹ء، ۱۰۳-۷۶

[5] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص ۱۹۔

[6] سیرت سید احمد شہید، ص ص ۹۰-۳۸۹، قیام الدین احمد، ص ص ۶۶-۳۶۵۔ ۴۰۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سید احمد بریلوی سے ملاقات ہوئی ہو۔ بہرحال احمد اللہ شاہ کی سرگرمیوں کے متعلق ہمیں کافی معلومات ملتی ہیں۔ آپ گوالیار سے آگرہ آئے، وہاں محفل سماع (جسے بعض شرائط کے ساتھ جائز سمجھا جاتا ہے) میں کثیر تعداد میں مسلمان اور ہندو دونوں شریک ہوتے تھے، احمد اللہ شاہ کی ان تقریبات پر انگریزوں کی نظر تھی، انھیں آگرہ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا، آپ وہاں سے اودھ کی طرف روانہ ہوئے۔ دریں اثنا اجودھیا میں، ہنومان گڑھی میں واقع مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا۔ سید امیر علی اور اُن کے رفقا، اس قضیہ میں شہادت پا چکے تھے۔ اودھ میں مسلمانوں میں ہنومان گڑھی کے واقعہ کی وجہ سے شدید غم و غصہ تھا۔ انگریزوں نے دریں اثنا، اودھ کے حکمراں نواب واجد علی شاہ کو معزول کرکے براہ راست انگریزی حکومت قائم کر دی تھی، اودھ کے عوام اور خواص، بلا لحاظ ملت اور مذہب انگریزوں سے بہت ناراض تھے۔ تقریباً اسی ماحول میں، نومبر ۱۸۵۶ء کو احمد اللہ شاہ لکھنؤ میں وارد ہوئے[۱]۔ احمد اللہ شاہ نے یہاں براہ راست لوگوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا، اودھ میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد وہی کہانی دہرائی گئی، جو تقریباً ایک صدی پہلے بنگال میں، پلاسی کی جنگ کے بعد رچی گئی تھی۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد تقریباً ۸۷ ہزار افراد بیکار ہو گئے تھے جن کی پرورش نواب واجد علی شاہ کی سرکار سے ہوتی تھی۔ اُن کی تنخواہوں پر تقریباً ۸۳ لاکھ روپئے خرچ ہونے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کا نقشہ کمال الدین حیدر کچھ اس طرح پیش کرتا ہے:-

"جب سے یہ ہنگامہ (انتزاع اودھ) برپا ہوا تھا اکل و شرب انسانی گم ہو گیا تھا مگر بے خبر محافظان دواب سے حیوانات بیزبانکو بھی کئی دن سے خوراک یومیہ میسر نہوئی تھی، جب یہ خبر مشروعاً چیف کمشنر کو پہونچی پرچہ پیام آیا کہ یہ حیوانات روز و شب کے فاقہ سے مرجائیں گے لہذا مناسب ہے کہ جو اونمیں سے بہتر ہوں منتخب کیے جائیں باقی سب کا حکم نیلام دیا جائے"

کمال الدین حیدر مزید لکھتے ہیں: "چیف کمشنر نے پہلے کاغذ جمع خرچ کارخانجات سلطانی اور ملازمین شاہی کا جائزہ لیا چنانچہ سب مجموع تراسی لاکھ

---

[۱] ہفتہ وار طلسم، لکھنؤ، ۲۱ نومبر ۱۸۵۶ء۔ ص ۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



> روپیہ تنخواہ ملازمین واقربائے شاہی کا مع کارخانجات نکلا۔ سوائے خرچ ضروریات ذات اقدس وخرید اسباب جدید وغیرہ اور ۷ ۸ ہزار آدمی سب مجموع ملازم ہر فرقہ وسپاہ کے تھے، چنانچہ بعد برطرفی چہارم فوج زماں خلد منزل فردوس منزل حضرت جنت مکان کے ۵۲ بٹالین نجیب وتلنگہ اور ساڑھے تین ہزار سوار سوائے ترکسو داران سواری"[۱]

واجد علی شاہ کی معزولی کا انجام یہ ہوا کہ تقریباً دس لاکھ کی بھری پُری خوش آبادی کا شہر لکھنؤ ویران ہو گیا۔ اس کی آبادی چند برسوں میں گھٹ کر صرف تین لاکھ رہ گئی۔ بہت سے لوگ بے کاری اور مفلسی سے بچنے کے لیے دوسرے مقامات پر چلے گئے اور جو لوگ کسی وجہ سے ترک وطن نہ کر سکے، مفلوک الحالی اور فقر و فاقہ کا شکار ہو گئے۔[۲] واجد علی شاہ کی معزولی کا وہی اثر اودھ پر پڑا تھا جو بنگال میں پلاسی کی جنگ اور انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد وہاں کے عوام پر پڑا تھا۔ اودھ میں بھی عوام نئے حکمرانوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے تھے۔ احمد اللہ شاہ کے لیے، اس صورت حال میں، عوام کو منظم کر کے جہاد پر مستعد کر دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اُن کے پیغام کا لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ اُنھوں نے احمد اللہ شاہ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں ایک دلیرانہ اور بہادرانہ جنگ لڑی لیکن انگریزوں کی فوجی طاقت اور "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے مقابلے میں احمد اللہ شاہ اور اُن کے رفقا، نہ ٹک سکے۔ بالآخر شاہ صاحب کو انگریزوں کے ایک پٹھو، پوائن کے راجہ نے فریب سے بلا کر شہید کر دیا۔[۳]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، شاہزادہ فیروز بخت، نانا صاحب، جھانسی کی رانی اور مولوی لیاقت علی نے جو اعلانئے مجاہدین آزادی کو جاری کیے ان میں 'جہاد' پر خاص توجہ دی گئی تھی۔[۴] ۱۸۵۷ء کی جنگ

---

[۱] کمال الدین حیدر، سوانح سلاطین اودھ، ص ص ۵۲-۵۱ اور ۱۷۱-۱۷۰، آئندہ بحوالہ کمال الدین حیدر۔

[۲] کمال الدین حیدر، ص ص ۵۲-۵۱۔

[۳] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ماثر دلاوری، تحقیقات اسلامی۔

[۴] S.A.A. Rizvi Freedom Struggle in Uttar Pradesh Vol - 1 p.p.438-39 455-58.



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



میں جو علماء کرام پیش پیش تھے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شاہ امداد اللہ مہاجر مکی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولوی سرفراز علی گورکھپوری، مولانا عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا محمد علی مونگیروی، ان میں قابل ذکر ہیں، مولوی سرفراز علی کی کوششوں سے بخت خاں روہیلہ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے بنگال آرمی میں صوبیداری کے عہدہ پر فائز تھے، مجاہدین کی صف میں شامل ہو کر کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں جو رد عیسائیت میں مولانا کیرانوی کے ساتھ تھے، جنگ آزادی کے ایک اہم رکن تھے۔

## علمی اور مذہبی جدوجہد

یہاں عیسائی مشنریوں کی سرگرمی کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ تاریخی شواہد کے اعتبار سے شمالی ہند میں عیسائی مشنریوں کی آمد اکبر کے عہد میں ہوئی۔ عبادت خانہ کی مذہبی مجلسوں میں عیسائی علماء بھی شریک ہوتے تھے۔ عبادت خانہ کے مذاکرے بتدریج مناظروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ مغل دور حکومت میں عیسائی مشنریز اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے لیکن وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو تبدیلی مذہب پر مائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے تسلط کے بعد عیسائی مشنریز کا فروغ ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے عیسائی مبلغین کو اشاعت عیسائیت کی پوری اجازت دیدی بہت سے عیسائی مبلغین ہندوستان آئے ان میں ایک اہم عیسائی پادری فینڈر تھا۔ فینڈر نے مروجہ یورپی علوم کی تحصیل کے ساتھ عربی، فارسی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔ عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے، یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں پھرتا رہا۔ اس نے اسلام اور عیسائیت پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ وہ آرمینا کے عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان رہ کر مسلمانوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کی کئی برس تک ناکام کوششیں کرتا رہا۔ وہ میسوپوٹامیہ اور ایران بھی گیا، ہر جگہ وہ مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے میں ناکام رہا، پے در پے ناکامیوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمان قرآن مجید کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اس میں انجیل مقدس کی برتری اور عیسائیت کی فوقیت پر جو بھی بحث ہوگی ان پر بے اثر ہوگی۔[1] بالآخر اس نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے، اپنے تئیں، ایک مدلل

---

[1] Muslim and Missionories p.p. 138-39

© rasailojaraid.com

کتاب جرمن زبان میں تحریر کی جس کا ترجمہ ۱۸۳۱ء میں آرمینی زبان میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کا ترجمہ "میزان الحق" کے نام سے فارسی زبان میں بھی شائع ہوا[1]۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہندوستان میں ایک بار پھر اسلام اور عیسائیت کی حقانیت پر مناظرے کے دروازے کھول دیے، کہا جاتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی عیسوی میں پہلا مناظرہ، عیسائیوں اور شاہ عبدالعزیز کے درمیان ہوا[2]۔ آہستہ آہستہ عیسائی پادریوں اور مسلمان علماء کے درمیان اکثر مناظرے ہونے لگے۔ فینڈر نے چُن چُن کر مسلمانوں کے سرکردہ افراد جن میں سید احمد خاں (بعد کے سرسید) کاظم علی سجادہ نشین شیخ سلیم چشتی، سید نورالحسن وغیرہ قابل ذکر ہیں مناظروں پر اکسایا، عیسائیت کی تبلیغ کے لیے عربی اور فارسی زبانوں میں مطبوعہ انجیل بھیج کر اُس پر اُن کی رائے طلب کی اور عیسائیت اور اسلام پر مناظرہ کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز عیسائیت کی اشاعت کے مقصد سے رکھی گئی تھی۔ فینڈر کو یقین تھا کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان عالم دین اُس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے باوجود، علمی طور اُن کی بنیادیں مضبوط تھیں۔ ملک کے مختلف گوشوں میں تمام مشکلات کے باوجود بے شمار مدرسے خاموشی سے دینی خدمات میں لگے ہوئے تھے۔ مدارس سے فارغین کی بڑی تعداد موجود تھی جو نہ صرف علوم قرآن وحدیث سے بہرہ ور تھے بلکہ توریت اور انجیل پر بھی بہت اچھی نظر رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی ایسے مناظرہ کے لیے تیار تھے۔ فینڈر، اپنی عیسائی نوازی اور عیسائی پرستی کی وجہ سے مدارس ومساجد سے لے کر بازاروں تک میں مسلمانوں کی گفتگو کا مرکز بن گیا تھا۔ پہلا نام جس نے فینڈر کو لاجواب کر دیا وہ پروفیسر سید نورالحسن[3] صاحب کا تھا۔

---

[1] پاول کے مطابق "میزان الحق" کے دو ایڈیشن کلکتہ اور آگرہ سے ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس کا پہلا اردو ترجمہ ۱۸۴۳ء میں مرزاپور سے اور ۱۸۵۰ء میں آگرہ سے شائع ہوا Muslim and Missionories p.p. 138-39.

[2] امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۴۷ء ص ۱۴۷، پاول اس واقعہ کو مناظرہ تسلیم نہیں کرتا۔ Muslim and Missionories p.104

[3] پورا نام سید محمد نورالحسن تھا۔ آپ اینگلو اورنٹیل کالج دہلی کے شعبہ عربی کے ہیڈ مدرس تھے۔ آپ کا =

۴۰۷

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فینڈر کے جواب میں بہت سے مسلمانوں نے پہل کی۔ آگرہ کے حافظ محمد جعفر نے ردِّ عیسائیت میں، فینڈر کو ایک مراسلہ لکھا اور ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ سے مطبوعہ کتاب "خلاصہ صولت ضیغم"[۱]، جو ردِ عیسائیت میں لکھی تھی، بھیجی۔

خلاصہ صولتِ ضیغم، سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ، بالخصوص علماء عیسائیت کی تبلیغ اور مناظرہ کو اسلام کے لیے بڑا خطرہ سمجھ رہے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ برطانوی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد، اقتصادی اور سیاسی پستی کا شکار یہ قوم خوب سمجھ رہی تھی کہ اس کے پس پشت کمپنی بہادر کی برطانوی حکومت کیا کردار انجام دے رہی ہے۔ دنیاوی طور پر مسلمان پستی میں تھے، عیسائی مشنریوں کی تبلیغی مہمیں، مناظرہ کے لیے دعوت کے اصل مقصد کو خوب سمجھ رہے تھے کہ اس راہ سے اُن کے سب سے قیمتی سرمایہ "اسلام" پر حملہ کی تیاریاں ہیں۔ اس کا تدارک ضروری تھا۔ خدا کے فضل سے اہلِ علم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں میں موجود تھی۔ سید عباس علی نے اس خطرہ سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ماضی میں جب عیسائی برسرِ اقتدار نہیں تھے، اُن کا عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے پرجوش پروپیگنڈہ بھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا، ہمارے علماء نے عیسائیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی لیکن دورِ حاضر کا یہ ایک مقدس ترین فرض ہے کہ وہ اپنی تمام تر قوت عیسائیوں کے باطل پروپیگنڈہ کے خلاف صرف کردیں۔ یہ لوگ اپنی شاطرانہ کوششوں سے آہستہ آہستہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیں گے[۲]۔

ردِ عیسائیت میں شیعہ علماء بھی پیچھے نہیں تھے۔ ۱۸۴۲ء میں مولانا سید محمد نصیر آبادی نے

---

= شمار ہندوستانی اساتذہ میں سب سے سینئر لوگوں میں تھا۔ آپ کا تعلق کاندھلہ کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ آپ نے اپنی تعلیم مدرسۂ رحیمیہ میں شاہ محمد اسحٰق صاحب سے حاصل کی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام آپ سے اکتساب کرنے والوں میں ہے۔

[۱] اب یہ کتاب عام طور سے دستیاب نہیں ہے۔ مولانا امداد صابری دہلوی نے اس کی ایک کاپی، جو اُن کے خاندانی کتب خانہ میں موجود تھی، پاول کو دکھلائی تھی۔ اس کے مصنف مولوی سید عباس علی تھے جو محمد جعفر صاحب کے بھائی تھے۔

[۲] - William Muir. The Mohammadan Controversy Calcutta Review. December 1845 p-450.



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فینڈر کے خطوط کے جواب میں، ردّ عیسائیت میں تحریر کردہ عربی، فارسی اور اردو کے رسائل بھیجے[1] سید محمد نصیر آبادی کی ایما پر اُن کے بھتیجے نے ردعیسائیت پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ سید دلدار علی مجتہد العصر اور اُن کے فرزند سید محمد بھی ردعیسائیت میں سرگرم عمل رہے[2]۔

علماء کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ حلقوں میں مسلمان وکلا بھی ردّ عیسائیت میں سرگرم رہے۔ اُن میں محمد کاظم علی، سید رحمت علی آگرہ کے دو وکیل خصوصیت کے حامل ہیں۔ سید[3] احمد خاں (سرسید) اُن دنوں آگرہ میں تعینات تھے۔ محمد کاظم علی اور سید رحمت علی کے اُن سے قریبی تعلقات تھے۔ تقریباً اسی وقت ایک اور عالم، مولانا آل حسن[4] کی شخصیت بھی ردعیسائیت میں سامنے آتی ہے۔ مولانا آل حسن کے متعلق ولیم میور، لیفٹننٹ گورنر یوپی لکھتا ہے کہ وہ بڑی صلاحیتوں کے آدمی تھے۔ مسلمانوں میں اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اُن کے علم و کمال کی بدولت اُن کو مسلم معاشرہ میں بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ صوبجات شمال و مغرب میں صدر امینی کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ نے فینڈر کے جواب میں ایک مدلل اور مبسوط کتاب "کتاب استفسار" لکھی جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھی[5]۔ مولانا آل حسن کی ردعیسائیت میں سرگرمی کو عیسائی انگریزی حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا۔ اُن پر رشوت کا جھوٹا الزام لگاکر دو سال کی سزا دیدی گئی[6]۔ آل حسن صاحب نے سزا کے خلاف اپیل دائر کی، آگرہ کے صدر جج کو مولانا کے خلاف کوئی ایسی شہادت نہیں مل سکی جس کی وجہ سے اُن کو سزا دی جاتی۔ مولانا باعزت بری کردیے گئے۔ مولانا کئی ماہ بعد قید فرنگ سے رہائی تو پا گئے لیکن ملازمت نہیں پا سکے۔ بہرحال مولانا آل حسن کی کتاب استفسار اسلامی حلقوں میں ردعیسائیت کے لیے بہت میسر اور کارآمد ثابت ہوئی۔ فینڈر نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کتاب استفسار

---

[1] Powel p. 171, [2] Powel p-176,

[3] حالی نے بھی ہندوستان میں عیسائی خطرہ اور اس کے مقابلہ کے لیے سرسید کی مساعی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو حیاتِ جاوید، لاہور ۱۹۶۶ء ص ص ۲۷ - ۲۲۳۔

[4] آپ کے والد کا نام سید غلام سعید تھا۔ موہان وطن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور اردو شاعر اور مجاہد جنگ آزادی، حسرت موہانی کا تعلق آپ کے خاندان سے تھا۔ ملاحظہ ہو، خالد حسن قادری، حسرت موہانی، دہلی ۱۹۸۵ء

[5] Powel p.182 [6] امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۴۹ء ص ۲۰۰، ۲۰۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



عیسائیوں کے خلاف ایک عظیم حربہ ثابت ہوئی تھی۔

اس دور میں رد عیسائیت میں سرگرم دو اور ممتاز شخصیتیں، مولانا رحمت اللہ کرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں کی تھیں۔ ان حضرات نے اپنے علمی کمال، حاضر دماغی اور زور تقریر سے ہر مناظرہ میں فینڈر اور دیگر عیسائی مبلغین کا، انجیل کے حوالوں سے مستند جواب دیا۔[1] ہر چند کہ مناظروں میں مسلمان علماء کا پلڑا بھاری رہا اور نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کی حقانیت، رسول اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر آخرالزماں اور قرآن پاک کو الہامی کتاب ثابت کرنے میں کامیاب رہے، بلکہ انھوں نے انجیل، اور توریت کے حوالوں سے بھی یہ ثابت کر دیا کہ محمد رسول اللہ کی بعثت کے بعد گذشتہ تمام مقدس مذہبی کتابیں اور ادیان منسوخ ہو چکے ہیں۔[2]

مناظروں کا اثر یہ ہوا کہ مشنریوں اور برطانوی حکومت کے عہدیداروں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مناظروں کی راہ سے مسلمانوں کو تبدیلی مذہب پر مائل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اُن کی توقع کے خلاف ان مذہبی مناظروں نے یہ آگہی پیدا کر دی کہ حکومت وقت کی سرپرستی میں کس طرح سے مشنریز اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ وہ علماء کی قیادت میں اپنے دین پر قائم رہے، لیکن غالباً انھیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت وقت خود عیسائیوں کی ہے اور پادریوں کا مستقل اسلام دشمن پروپیگنڈہ رنگ لائے گا۔ اسی اندیشہ کے تحت علماء کرام کی اکثریت بغیر تفریق مسلک، جا بجا انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل تھی یہی خیالات کم و بیش ہندوؤں کے بھی تھے کیونکہ مشنریز ہندوستان کے تمام مذہبی پیشواؤں کا مذاق اڑا رہے تھے۔[3]

غرض یہ کہ ہندوستان میں کمپنی کی برطانوی حکومت کے قیام نے، ہندوستانیوں کے اقتصادی استحصال کے ساتھ اُن کے مذاہب پر نکتہ چینی اور حملوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کی وجہ سے عام ناراضگی پائی جاتی تھی۔ بالخصوص مسلمانوں میں

---

[1] فرنگیوں کا جال، ص ص ۱۶۸ - 115۔

[2] فرنگیوں کا جال ص ص ۱۶۸ - 115۔

[3] فرنگیوں کا جال ص ص 119۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


اس کا اثر زیادہ تھا، مذہب سے لگاؤ اور اس کے تحفظ کا ان میں شدید احساس ابھر آیا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی شکایت تھی ۱۸۵۵ء تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ تبلیغ اور مناظرہ کے نام پر عیسائی مشنریز کا ہندوستانی مذاہب کے تمسخر نے جلتے پر تیل کا کام دیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ عظیم آزادی کی راہ ہموار کر دی۔ بیرک پور میں منگل پانڈے کی بغاوت اور مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی بغاوت کے پس پشت انگریزوں کے خلاف اُن کی سیاسی بازی گریوں، اقتصادی استحصال اور مذاہب پر گندے اور رکیک حملوں کی نفسیات کارفرما تھی۔

آج ۱۹۹۴ء میں ہندوستان فرقہ وارانہ منافرت سے دوچار ہے لیکن ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہندوستان میں یہ بات مفقود تھی۔ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذاہب پر سختی سے قائم تھے، مذہبی فرائض ادا کرتے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے مذاہب کے تقدس کو تسلیم کرتے اور احترام کرتے تھے۔ اس کی بے شمار مثالیں ۱۸۵۷ء کے درمیان ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران، مجاہدین آزادی نے بہت سے اعلانئے شائع کئے تھے ان میں ایک اعلانیہ کا نام "فتح اسلام" تھا اس اعلانیہ میں برطانوی حکومت کی صدسالہ تصویر پیش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ وہ کس طرح سے ہندوستان کے دو بڑے مذہب اسلام اور ہندو مذہب کو برباد اور مسخ کر رہی ہے۔ اعلانیہ میں یہ اپیل تھی کہ عوام اپنا امیر منتخب کرلیں تاکہ انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑی جا سکے۔ ہندوؤں سے بھی اپیل تھی وہ اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے اس امیر کے ساتھ شریک ہو جائیں، تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی بھائیوں کی طرح مل جل کر ایک دوسرے کے مذہب کا تحفظ کر سکیں[1]۔ اسی طرح شاہزادہ فیروز شاہ کا اعلانیہ بھی قابل توجہ ہے: "یہ سب لوگوں کے علم میں ہے کہ اس دور میں ہندوستان کے عوام، ہندو اور مسلمان، دونوں کافر اور دھوکا باز انگریزوں کے ظلم و ستم کا شکار رہ کر تباہ ہو رہے ہیں[2]"۔

---

[1] S.A.A. Rizvi, Freedom Struggle in U.P. Vol. I p. 456-58

[2] کنہیا لال، تاریخ بغاوت ہند، ۱۸۵۷ء، نول کشور ۱۹۱۶ء، ص ۳۸۵

۱۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ان اعلانیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے رویہ اور مشنریز کی عیسائیت کی تبلیغ سے ہندوستانی عوام، بلاتفریق مذہب، اپنے اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے شعوری طور پر بیدار تھے۔ بہادر شاہ ظفر، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، بیگم حضرت محل، رانی جھانسی وغیرہ کے اعلانئے اس کا مزید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ابتدا اور اس کے جبری استیصال تک، الہ آباد، لکھنؤ، بریلی، کانپور، دہلی، گوالیار، جھانسی وغیرہ، جو بغاوت کے مرکز تھے، ہر جگہ علماء اور فارغین مدرسہ پیش پیش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی حکومت نے ۱۸۵۸ء میں برسر اقتدار آنے تک، علماء اور مسلمانوں کو خصوصًا اپنے جور و ستم کا نشانہ بنایا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بغیر مقدمہ چلائے نذرِ دار کر دیے گئے یا گولی کا نشانہ بنا دیے گئے[1] جو لوگ روپوش ہو گئے تھے اُن کی تلاش جاری رہی اور جیسے جیسے یہ لوگ گرفتار ہوتے گئے، یہ بھی دار پر لٹکا دیے گئے یا عمر قید کی سزا دے کر جزیرہ انڈمان میں قید کر دیے گئے[2] پورے شمالی ہندوستان میں برسوں تک انگریزی بربریت اور ظلم و ستم کا ننگا ناچ ہوتا رہا۔ اس کا شکار مسلمان ہی تھے۔ جواہر لال نہرو اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:-

"۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکمرانوں کا ظلم و ستم، ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں پر زیادہ رہا" اس کی تائید برطانوی اور ہندوستانی مورخین بھی کرتے رہے ہیں[3] مسلمانوں پر مظالم کی انتہا دیکھ کر جارج کیمبل کو یہ اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمان بحیثیت جماعت بالکل نابود نہ ہو جائیں[4] مسلمان انگریزوں کی نگاہ میں بے حد خطرناک اور خوفناک قوم تھی۔ رسل لکھتا ہے:-

---

[1] مولوی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق ۲۷ ہزار مسلمان صرف دہلی میں شہید کیے گئے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ۔

[2] مولانا فضل حق خیرآبادی، مولوی جعفر تھانیسری وغیرہ۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، اے آر ملک ص ۱۸۷-۱۸۲

[3] ملاحظہ ہو، A. Lyall, Asiatic Studies, London 1884, ص ص ۴۰-۲۳۹، تاراچند، ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا، جلد دوم، دہلی ۱۹۶۷ء ص ۳۶۷۔

[4] Campbell, Memoires Vol-II p-397.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



The fact is that the Mohammadan element in India is that which causes us most trouble and provokes, the largest share of our hos--tility, Our missionories make no progress in the Musalman Districts. Our religious and educational movements are watched by the Ma-ulvies and fanatics with greatest suspicion. Our antagonism to the followers of Mohammad is far stronger than that between us and wo--rshippers of Shiva and Vishnu. They are un--questionably more dangerous to our rule.[1]

"یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا طبقہ ہمارے لیے زیادہ مشکلات پیدا کر رہا ہے اور ہماری دشمنی کو فروغ دینے میں زیادہ سرگرم کار ہے۔ مسلمان اضلاع میں ہماری مشنری تحریکیں کچھ بھی پیش رفت نہیں کر سکی ہیں۔ مولوی لوگ اور متعصب مسلمان ہماری مذہبی اور تعلیمی تحریکوں کو سخت شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شیو اور وشنو کے پرستاروں کے مقابلے میں محمدؐ کے اطاعت گزار ہمارے بڑے مخالف ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔"

مرزا اسد اللہ خاں غالب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دہلی ہی میں مقیم رہے۔ انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کیا تو باوجود تمام حزم و احتیاط کے ان کے قلم سے نکل ہی گیا کہ یہاں میرے سامنے خون کا وسیع دریا ہے، صرف خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اور کیا دیکھنا باقی ہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ مہذب

---

[1] Russel, My Diary in India in the years 1858-59. London 1859 p-283



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دنیا کے لیے، شرمناک ہے۔ تیس[۱] شاہزادوں پر مقدمہ چلا کر دار پر چڑھا دیا گیا یا سر قلم کر کے بادشاہ کے پاس تحفتاً بھیجا گیا[۱]۔ اسی ذیل میں، ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ انگریزی سپاہیوں نے ان تمام لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا جو اُن کو راہ میں ملتے گئے، میاں محمد امیر پنجہ کش اور بہت سے شریف خاندانی لوگ، انگریزوں کی بربریت کا شکار ہوئے۔ محمد امیر پنجہ کش کے علاوہ مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے، نیاز علی واقعہ خواں اور چیلیوں کے کوچہ کے بہت سے لوگ، دار پر چڑھا دیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف کوچہ چیلان کے چودہ سو افراد کو راج گھاٹ کے دروازہ سے دریا پار لے جا کر گولیوں سے ختم کر دیا گیا اور ان کی لاشوں کو دریا میں پھنکوا دیا گیا[۲]۔

دہلی سے مسلمانوں کا تقریباً مکمل اخراج ہو چکا تھا۔ جب عام معافی کا اعلان ہوا تو پہلے دہلی کی ہندو آبادی کو، اُن کی املاک کی مالیت کا دس فیصد جرمانہ ادا کر کے داخلہ کی اجازت ملی۔ چند ماہ بعد مسلمانوں کو اُن کی املاک کی مالیت کا پچیس فیصد جرمانہ ادا کر کے داخلہ کی اجازت دی گئی۔ یہ تو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا جا رہا تھا، لیکن ذرا یہ غور فرمائیں کہ انیسویں صدی کی مہذب ترین اور طاقتور انگریز قوم کا رویہ مسلمانوں کے لیے خود اُن کے ملک میں کیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں برطانوی وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے ہندوستانی گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو یہ ہدایت بھیجی کہ وہ تمام شہری عمارات جو مسلمانوں کے رسم و رواج سے تعلق رکھتی ہوں، مسمار کر دی جائیں، بغیر کسی خیال کے کہ اُس کے ساتھ اُن کے کیا قدیمی احترامی جذبات اور عمارتوں کے فنی پہلو ہیں[۳]۔ یہ حکم واضح طور پر جامع مسجد کی مسماری کا تھا جس پر انگریزوں نے قبضہ کر کے فوج کی چھاؤنی بنا دی تھی۔

انگریزوں نے اپنے اقتدار کی بحالی اور اپنی حکومت کی مضبوطی کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کو نشانۂ ہدف بنایا۔ ہندوستان میں امتِ مسلمہ پر بڑا سخت وقت تھا۔

---

۱۔ ظہیر دہلوی، داستانِ غدر، لاہور ۱۹۵۵ء ص ۱۶۴ ۲۔ ایضاً ص ۱۷ - ۱۶۹

۳۔ خط نمبر ۹، مورخہ ۹ / اکتوبر ۱۸۵۷ء بحوالہ Letter from Her Majesty. Minister's February 1856- to February 1862. Canming Papers London.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ضرورت اس بات کی تھی کہ قوم کو کسی طور سے مزید نقصانات سے بچایا جائے۔ اُن سخت حالات میں سید احمد خاں نے دور اندیشی سے کام لیا۔ اسباب بغاوت ہند لکھی۔ وقت کے تقاضہ کے تحت مسلمانوں اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کبھی کبھی اُن حدود سے تجاوز کر گئے جو علماء دین کی نظر میں قابل گرفت اور ناپسندیدہ تھی، لیکن سید احمد خاں نے جو بھی کیا وہ بر بنائے خلوص تھا۔ ہر چند کہ برطانوی حکومت سید احمد خاں کی آواز پر توجہ دیتی تھی لیکن مسلمانوں کے متعلق اُن کی پالیسی "غیر اعتماد اور عداوت" ہی کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علماء کرام اور عام مسلمانوں کے جوش و خروش، اتحاد اور قربانیوں نے اُن کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ مسلمانوں کا اتحاد، انگریزی حکومت کے استحکام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ سید احمد شہید کے رفقاء اور ہم نوا نہ صرف ۱۸۵۷ء میں سرگرم عمل رہے تھے بلکہ ۱۸۵۸ء کے بعد بھی، سرحدی علاقوں میں اُن کی سرگرمی اپنی تمام تر بے سروسامانیوں کے باوجود جاری تھی[1] انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پاش پاش کرنے کے لیے حکمت عملی سے کام لے کر دو بڑے اقدام کیے۔ سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف زبردست فوجی کارروائی اور ایک مستقل خفیہ پولس کے محکمے کا قیام، جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ سرحدی علاقوں میں پہنچنے والی امداد کے اصل ماخذ کا پتہ لگائیں۔ دوم، حکومت کی طرف سے مناظروں کی ہمت افزائی۔ ان مناظروں کا موضوع یہ رکھا گیا کہ کیا برطانوی حکومت کے خلاف جہاد جائز ہے؟ سرحدی علاقہ میں انگریزوں کی فوجی حکمت عملی بری طرح ناکام رہی[2] ہاں خفیہ پولس کے محکمہ کے قیام اور اس کی کارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال، بہار، یوپی اور پنجاب میں مجاہدین کے مراکز پر یلغار کر کے ان کے خلاف مقدمات قائم کر کے حبس دوام اور طویل مدت کی سزائیں سنائی گئیں[3] مناظرے یک طرفہ ہوئے۔ حکومت کی فوجی اور پولس کارروائیوں کے ساتھ عدالتی کارروائیوں نے، مسلمانوں کی قوت مدافعت بھی وقتی طور سے ختم کردی تھی۔ اس کا بڑا سبب ۱۸۵۷ء کی برطانوی

---

[1] تاراچند، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم ص ص ۲۹-۲۷

[2] تاراچند، جلد دوم، ص ص ۳۰-۲۹۔ [3] ایضاً



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بے رحمانہ اور سفاکانہ کارروائیاں تھیں۔ مذہبی طور سے مسلمانوں میں مزید انتشار پیدا کرنے کے لیے مکہ معظمہ سے مفتی مکہ کا فتوٰی بھی انگریزوں نے حاصل کر کے، ہندوستان بھر میں عام کر دیا کہ برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کرنا جائز نہیں ہے[1] انھوں نے بعض ہندوستانی علما کو بھی اسی طرح کے فتوے دینے پر آمادہ کر لیا[2]۔ بات یہیں نہیں ختم ہوئی، آثار و قرائن کے علاوہ بعض ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن سے اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت ختم کرنے کے لیے مسلکی اختلافات کو بھی ہوا دی۔ اگر ہم ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد، مسلمانوں کے اندر مسلکی اعتبار سے ابھرنے والے مختلف گروہوں پر نظر ڈالیں اور حکومت کی طرف سے اُن کی پذیرائی پر غور کریں تو بڑی حد تک بات از خود صاف ہو جاتی ہے۔ پنجاب میں احمدیہ فرقہ کا عروج، یوپی میں بریلوی فرقہ پر حکومت کی توجہ کے پس پشت مسلمانوں کی سرپرستی مقصود نہیں تھی بلکہ سیاسی مصلحت زیادہ کارفرما تھی تاکہ سنی مسلمانوں کو فرقوں کے خانہ میں تقسیم کر کے مسلمانوں کے سب سے بڑے گروہ کو انتشار اور نفاق میں مبتلا کر دیا جائے۔ شیعہ سنی مسلکی اختلافات کو انگریزی حکومت کی سرپرستی میں اور ابھارا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں میں مسلکی اختلافات موجود تھے۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ ان ہی اختلافات کی وجہ سے اُن کے اندر مختلف گروہ پائے جاتے تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے مسلکی اختلافات کی نوعیت علمی مباحث اور افراد تک محدود تھی۔ اللہ کی وحدانیت اور جناب رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی حقانیت پر ایمان، مختلف گروہوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھا۔ مسلکی اختلافات کی نوعیت فروعی تھی، اس میں شدت اور کٹرپن نہیں تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فرو ہونے کے بعد، ابھرتی ہوئی گروہی عصبیت نے مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ اُن کی ساری قوت مسلمانوں میں اتحاد کے قیام کے بجائے مسلکی مباحث، اور اختلافی مسائل کی نذر ہونے لگیں۔ انگریزوں کی مراد بر آئی۔ اُن کی سیاسی حکمت عملی کامیاب ہو گئی اور مسلمان آہستہ آہستہ انتشار کے سیل گراں میں بہہ گئے۔

---

[1] تاراچند، جلد دوم۔ ص ص ۳۰-۲۶، رام گوپال۔ انڈین مسلمز۔ بمبئی ۱۹۵۹ء ص ص ۲۵-۲۴۔

[2] مولوی کرامت علی جون پوری، مولوی عبداللطیف وغیرہ۔۔۔۔۔



© rasailojaraid.com